



HJRS Link: [Journal of Academic Research for Humanities JARH \(HEC-Recognized for 2023-2024\)](#)

Edition Link: [Journal of Academic Research for Humanities JARH, 3\(4\) October-December 2023](#)

License: [Creative Commons Attribution-Share Alike 4.0 International License for JARH](#)

Link of the Paper: <https://jar.bwo.org.pk/index.php/jarh/article/view/361>

مستنصر حسین تارڑ کا ناول "اے غزالِ شب": مارکسیت سے وجودیت تک

MUSTANSAR HUSSAIN TARAR'S NOVEL 'AY GHAZAAL-I SHAB': FROM MARXISM TO EXISTENTIALISM

Corresponding Author 1:	BABAR REHMAN SHAH, PhD Scholar, Urdu Language and Literature Department, University of Sargodha, Sargodha, Pakistan, Email: babarrehman56@gmail.com,
-------------------------	--

Paper Information

Citation of the paper:

(JARH) Shah, B. R., (2023). Mustansar Hussain Tarar's Novel 'Ay Ghazaal-i Shab': From Marxism to Existentialism. In *Journal of Academic Research for Humanities*, 3(4), 28–38B.

Subject Areas for JARH:

- 1 Urdu Literature
- 2 Humanities

Timeline of the Paper at JARH:

Received on: 21-11-2023
Reviews Completed on: 06-12-2023
Accepted on: 15-12-2023
Online on: 16-12-2023

License:



[Creative Commons Attribution-Share Alike 4.0 International License](#)

Recognized for BWO-R:



Published by BWO Researches INTL.:



Abstract

Urdu Novel has a realist thematic foundation based on societal reforms which was further strengthened during the heyday of Marxism, consequently, a whole lot of Urdu Fiction is based on social motifs. Mustansar Hussain Tarar (b:1939) is widely famous for his Travelogues, but apart from being an acclaimed Dramatist and Columnist, he is also a renowned Urdu Novelist and his Novels explore a whole range of themes involving issues of broader contemporary relevance and beyond. In this context, Tarar's novel *Ay Ghazaal-i Shab* (2010) depicts the story of several ideologically motivated Marxist Asian immigrants, trying to cope with the harsh realities of living abroad in Eastern Europe. These revolutionary immigrants not only bore the brutalities of the Bolshevik version of Communism, but also witnessed the shattering of the most optimistic and incredible dream of the 20th century, in the form of the Soviet Union's collapse in 1992, and as a result, the emergence of the Russian Federation from its ashes. Amid this chaos, the characters of this novel find themselves completely disenchanted from their ideals related to class abolishment and Internationalism, they are entangled in homesickness due to racial discrimination in Eastern Europe and can be seen all over the place, trying to figure their way out to extract at least some meaning from their existence in an abyss of nothingness. Tarar has skillfully delineated this ideological rift in his masterpiece. This article will ponder this paradigm shift in light of Tarar's aforementioned Novel.

Keywords: Mustansar Hussain Tarar, *Ay Ghazaal-i Shab*, Ideology, Marxism, Existentialism, Disillusionment,

ابتدائی:

مستنصر حسین تارڑ کا ناول اے غزالِ شب (2010) چند روشن خیال نظریاتی مہاجرین کی کہانی پیش کرتا ہے، جو ایک آدرشی معاشرے کے خواب کی تعبیر کی خاطر اپنے گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ مہاجرین طبقاتی تقسیم پر مبنی نظام کے انہدام اور بین الاقوامیت کے نعروں پر لبیک کہتے ہیں، مگر کچھ ہی عرصے میں یورپی نسل پرستی کی گزند ان تک پہنچ جاتی ہے، اور طبقاتی تقسیم کے انہدام کا خواب حسرت کا روپ دھار لیتا ہے، یہاں تک کہ عظیم خوابوں کی یہ بستی خود اپنا وجود بھی برقرار نہیں رکھ پاتی۔ یہ نظریاتی ریخت تمام نمائندہ کرداروں کو اپنے وجود کی اوٹ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیتی ہے، اور یوں ان کرداروں میں وطن کی جانب مراجعت اور اپنی اصل کی جانب لوٹ جانے کی شدید خواہش جنم لیتی ہے۔ یہ ناول کرداروں کی اسی اندرونی کشمکش کا مرقع ہے۔

میسویں صدی میں اردو ناول بہ تدریج روبہ عروج رہا ہے، اس دوران میں متنوع تحریکات و میلانات نے اردو ناول کے دامن کو رنگارنگ خیالیوں (Themes) سے مالا مال کیا ہے۔ ان تحریکات میں ترقی پسند تحریک بھی شامل ہے، جو کہ مارکسی فکر پر اپنی بنیادیں استوار کرنے کی داعی ہے۔ مغرب میں مارکسی فکر بھی جدیدیت کے بڑے دھارے ہی کا ایک پہلو تھی، تاہم ہندوستانی زبانوں کے ادب میں ارتقائی تسلسل کی بھول بھلیوں میں بے طور الجھنے کے باعث ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کو آپس میں حلیف کے بجائے حریف دبستان گردانا گیا، یہ بحث کہ ہندوستانی زبانوں میں ایسے رویے کیوں پروان چڑھے؟ بذاتِ خود بہت دل چسپ ہے، مگر یہ اس تمحیص کا مناسب محل نہیں ہے۔ تاہم یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ مارکسی فکر میسویں صدی کے نصفِ اول تک دنیا بھر میں مقبول ترین سیاسی و ادبی نقطہ نگاہ

رہ چکی ہے۔ سوویت رہنما جوزف اسٹالن کے انتقال (1953) کے بعد سے اس فکر کو بنیاد بنا کر استوار کیے گئے حکومتی ڈھانچے میں موجود خرابیوں اور رخنوں کی قلعی کھلتی ہی چلی گئی اور اس فکر کی مقبولیت بھی دن بہ دن گھٹتی چلی گئی، یہاں تک کہ 1992 میں سوویت یونین کے انہدام کے ساتھ اس نظام کی بساط ہی اٹھا کر رکھ دی گئی۔

اردو ادب نے بالعموم، اور اردو ناول نے بالخصوص ترقی پسند تحریک اور مارکسی فکر پر محیط خیالیوں کا کھلے بندوں سویکار کیا ہے۔ تاہم، انجمن ترقی پسند مصنفین کی تاریخ نشیب و فراز کی الگ ہی داستان سنائی ہے۔ تقسیم برصغیر (1947) کے لگ بھگ یہ تحریک اپنی سیاسی معنویت اور انقلابی آہنگ کے نصف النہار پر تھی، مگر تقسیم برصغیر کے بعد دونوں ممالک (بھارت اور پاکستان) کی سیاسی بساط کچھ اس انداز سے بچھی، کہ اشتراکی نظام کی تگ و دو اور سرخ انقلاب کے خواب ماند پڑتے گئے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ترقی پسند تحریک کا تقسیم کے ارتداد حوالے سے سخت موقف تھا، جب کہ زمینی حقائق اس موقف کے سراسر برعکس تھے۔ تقسیم کے باعث جو نئی صورت حال پیش نظر تھی، اس میں مارکسیت سے کہیں زیادہ وجودیت کے فلسفے کی افزائش کے لیے حالات سازگار تھے۔ اس Paradigm Shift کی وضاحت کے لیے رمانند ساگر (1917-2005) کے ناول اور انسان مر گیا (1948) کی مثال مد نظر رکھیے تو واضح ہوتا ہے کہ بیک وقت اس ناول کو ترقی پسند حلقے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، جب کہ جدیدیت پسندوں کے پیش رو حلقہٴ اربابِ ذوق کے اکابرین کے نزدیک یہی ناول لائق ستائش ٹھہرا، اور بعد ازاں رمانند ساگر کے ناول اور انسان مر گیا کو اردو کے نمایاں وجودی ناولوں میں شمار کیا جانے لگا۔

مقاصد تحقیق:

1. مارکسی فکر کے زوال و ابطال اور وجودی رجحان کے آغاز و ارتقا کا پس منظر واضح کرنا۔

2. مستنصر حسین تارڑ کے زیر بحث ناول کی روشنی میں مارکسیت اور وجودیت کے داخلی رشتے کی نوعیت، ابعاد اور جہات کی وضاحت کرنا۔

3. مذکورہ بالا دونوں مکاتیب فکر کے اتصال کی گمشدہ کڑیوں کی بازیافت کرنا۔

تحقیقی سوالات:

1. مارکسیت اور وجودیت کے مابین داخلی رشتوں کی نوعیت اور مضمرات کیا ہیں؟
2. وجودی مارکسیت کے تناظر میں مستنصر حسین تارڑ کا زیر بحث ناول کن اسباب و علل کی بنیاد پر اہمیت کا حامل ہے؟

اہمیت و افادیت:

بیسویں صدی میں اردو ناول بہ تدریج روبرو عروج رہا ہے، اس دوران میں متنوع تحریکات و میلانات نے اردو ناول کے دامن کو رنگارنگ خیالیوں (Themes) سے مالا مال کیا ہے۔ ان تحریکات میں ترقی پسند تحریک بھی شامل ہے، جو کہ مارکسی فکر پر اپنی بنیادیں استوار کرنے کی داعی ہے۔ مغرب میں مارکسی فکر بھی جدیدیت کے بڑے دھارے ہی کا ایک پہلو تھی، تاہم ہندوستانی زبانوں کے ادب میں ارتقائی تسلسل کی بھول بھلیوں میں بے طور الجھنے کے باعث ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کو آپس میں حلیف کے بجائے حریف دبستان گردانا گیا، یہ بحث کہ ہندوستانی زبانوں میں ایسے رویے کیوں پروان چڑھے؟ بذاتِ خود بہت دل چسپ ہے، مگر یہ اس تحقیق کا مناسب محل نہیں ہے۔ تاہم یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ مارکسی فکر بیسویں صدی کے نصفِ اول تک دنیا بھر میں مقبول ترین سیاسی و ادبی نقطہ نگاہ رہ چکی ہے۔ سوویت رہنما جوزف اسٹالن کے انتقال (1953) کے بعد سے اس فکر کو بنیاد بنا کر استوار کیے گئے حکومتی ڈھانچے میں موجود خرابیوں اور رخنوں کی قلعی کھلتی ہی چلی گئی اور اس فکر کی مقبولیت بھی دن بہ دن گھٹتی چلی گئی، یہاں تک کہ 1992 میں سوویت یونین کے انہدام کے ساتھ اس نظام کی بساط ہی اٹھا کر رکھ دی گئی۔

اردو ادب نے بالعموم، اور اردو ناول نے بالخصوص ترقی پسند تحریک اور مارکسی فکر پر محیط خیالیوں کا کھلے بندوں سویکار کیا ہے۔ تاہم، انجمن ترقی پسند مصنفین کی تاریخ نشیب و فراز کی الگ ہی داستان سنائی ہے۔ تقسیم برصغیر (1947) کے لگ بھگ یہ تحریک اپنی سیاسی معنویت اور انقلابی آہنگ کے نصف النہار پر تھی، مگر تقسیم برصغیر کے بعد دونوں ممالک (بھارت اور پاکستان) کی سیاسی بساط کچھ اس انداز سے بچھی، کہ اشتراکی نظام کی تگ و دو اور سرخ انقلاب کے خواب ماند پڑتے گئے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ترقی پسند تحریک کا تقسیم کے ارتداد حوالے سے سخت موقف تھا، جب کہ زمینی حقائق اس موقف کے سرسبز برعکس تھے۔ تقسیم کے باعث جو نئی صورت حال پیش نظر تھی، اس میں مارکسیت سے کہیں زیادہ وجودیت کے فلسفے کی افزائش کے لیے حالات سازگار تھے۔ اس Paradigm Shift کی وضاحت کے لیے رامانند ساگر (1917-2005) کے ناول اور انسان مر گیا (1948) کی مثال مد نظر رکھیے تو واضح ہوتا ہے کہ بیک وقت اس ناول کو ترقی پسند حلقے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، جب کہ جدیدیت پسندوں کے پیش رو حلقہ ارباب ذوق کے اکابرین کے نزدیک یہی ناول لائق ستائش ٹھہرا، اور بعد ازاں رامانند ساگر کے ناول اور انسان مر گیا کو اردو کے نمایاں وجودی ناولوں میں شمار کیا جانے لگا۔

تعارف:

مستنصر حسین تارڑ کے ناول اے غزالِ شبمیں نظریات کی اس نمونیتی قلبِ مہمیت کو ایک منفرد زاویہ نگاہ سے پیش کیا ہے۔ تارڑ کے اس ناول کی روشنی میں یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وجودی فلسفے کا پینا اور پھر ادبی وجودیت کا فروغ پانادر حقیقت مارکسیت کے غیر مقبول ہونے کے لازمی نتائج تھے۔ کم از کم اس ناول میں پیش کیے گئے کرداروں کی پتا کی حد تک یہی مترشح ہوتا ہے کہ ایک عظیم اجتماعی فلاح

کے خواب کے علی الاعلان ابطال پر، فرد خود کو اپنی اصل کی جانب مراجعت پر مجبور پاتا ہے۔ نظریاتی شکست کے بعد فرد کے سامنے مفاہمت کا راستہ ہی بچتا ہے۔ تاہم، اس راستے پر قدم قدم پہ ہزیمت اٹھانا انسان کا مقدر ٹھہرتا ہے، اور ضمیر کی متصل ملامت کے باعث وہ اپنی نظروں میں خود ہی گر جاتا ہے، البتہ اس عمل کے دوران انسان کو اپنی ذات کا عرفان بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ اقبال خورشید اے غزالِ شبکی کہانی کے متعلق لکھتے ہیں:

اے غزالِ شبخوابوں کی شکست و ریخت کا ایک مربوط اور گتھا ہوا قصہ ہے۔ ان پاکستانیوں کا حزن، جنہوں نے مساوات پر مبنی اجلے معاشرے کا سپنا دیکھا۔ سوویت یونین قبلہ ٹھہرا۔ نظریات اپنے وطن سے میلوں دور لے گئے۔ کوئی ماسکو میں جا بسا، کسی نے برلن کو ٹھکانہ بنایا، کسی نے بوداپیسٹ میں خود کو دریافت کیا۔ اپنا وطن چھوڑ کر نئی زمینوں پر ذات کا بیج بویا۔ مزدوروں کے راج میں وہ خوش تھے کہ اچانک سب ڈھے گیا۔ سرمایہ دارانہ نظام نے کاری وار کیا۔ سوویت یونین منہدم ہوا۔ اپنی جڑوں سے کٹ چکے ان انسانوں کی زندگیاں یک دم بدل گئیں۔ اس بدلاؤ نے ان کی سماجی اور نفسیاتی زندگیوں کو اتھل پتھل کر دیا۔ اے غزالِ شباس اتھل پتھل کی پتا ہے (اقبال، 2014، ص 13)۔

خواب کا ابطال تو ممکن ہے، مگر نظریے کا ابطال بذاتِ خود ایک مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے۔ نظریہ غیر مقبول ہو سکتا ہے، اپنے اہداف بدل سکتا ہے، مقصود کے ابعاد و جہات کا از سر نو تعین کر سکتا ہے، پر اس کا وجود قائم بذات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مارکسیت کے غیر مقبولیت کے بطن سے جب نو مارکسی فکر نے جنم لیا تو، نظریے کے اسی ثبات پر توجہ مرکوز کی گئی۔ پروفیسر عتیق اللہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

آئیڈیالوجی میں جو کچھ نمائندگی ہوتی ہے وہ ان حقیقی رشتوں کے نظام سے وابستہ نہیں ہوتی جو افراد کے وجود پر تسلط جمالیتے ہیں بلکہ افراد کا ان کے ان حقیقی رشتوں کے تعلق سے تخیلاتی رشتہ ہوتا ہے جن میں وہ زندگی بسر کرتے ہیں (عتیق اللہ، 2018، ص 32)۔

ناول میں پیش کیے گئے پانچوں خاندانوں کی زندگی معروضی اعتبار سے مختلف ہونے کے باوجود حیرت انگیز مشابہت رکھتی ہے۔ چوہدری وارث لائل پور سے تعلق رکھتا ہے، تاہم سوویت یونین کی جاذبیت اُسے موجودہ روس کے صدر مقام ماسکو میں سکونت اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ چوہدری وارث اپنی بیٹی نصرت اور بیٹے رانجھا کے ساتھ مقیم ہے۔ سوویت یونین کے انہدام کے بعد روس میں روز افزوں سرمایہ دارانہ نظام سے وارث مفاہمت کر لیتا ہے اور ایک نمایاں سرمایہ دار کے طور پر ابھر کر سامنے آتے ہے۔ اس کا دولت کدہ بزم آرائیوں کے سبب شہرت رکھتا ہے، اور اس کے یہاں روسی سرمایہ دارانہ نظام اپنی تمام تر چکاچوند کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ تاہم، چوہدری وارث کے دل میں شکستِ خواب کے باعث ایک کسک ہمہ وقت موجود رہتی ہے، جو کہ خاص موقعوں پر ایک ٹیس کی شکل اختیار کر کے روح کو کچھ کے لگاتی رہتی ہے۔

کراچی سے تعلق رکھنے والے عارف نقوی کی زندگی کی یہ دوسری نظریاتی ہجرت ہے، جو اُسے مشرقی برلن (جرمنی کا صدر مقام) میں لے آتی ہے۔ عارف دراصل لکھنؤ کا باسی ہے، جو تقسیم برصغیر کے وقت کراچی منتقل ہوا تھا، اور پھر مارکسی خواب کی تعبیر سوویت یونین کی جانب کھینچا چلا گیا۔ مشرقی برلن میں عارف کی ملاقات ہلٹرڈ سے ہو گئی، جس نے عارف کے لیے وطن واپسی کو مزید کٹھن بنا دیا۔ ہلٹرڈ اور عارف کی اکلوتی اولاد انگے ہے۔ وارث چوہدری کے برعکس، جو کہ ماسکو سے وطن واپسی کے منصوبے کو عملی جامہ نہیں پہنا

سکتا، عارف نقوی پاکستان واپس آتا ہے، جہاں اُس کی ملاقات اپنے ہی ایسے دیگر تارکین وطن سے ہوتی ہے، جو عارف ہی کی طرح شکستِ خواب کی ہزیمت اٹھانے کے بعد اپنی جڑوں کی تلاش میں مراجعت اختیار کرتے ہیں۔

لاہور سے تعلق رکھنے والے سردار قالب کا کردار بھی کافی دلچسپی کا حامل ہے۔ قالب کے والد سردار سیماہ شاعر انقلاب کے طور پر جانے جاتے ہیں، تاہم ان کی نجی زندگی کے بعض انتہائی تلخ حقائق ان کی ترقی پسندی اور انسان دوستی کا صاف صاف منہ چڑاتے ہیں۔ بہر حال سردار قالب اپنے والد کے کرم فرما کے طفیل ماسکو جا پہنچتا ہے، جہاں اس کی شادی حالیہ روسی صدر ولادیمیر پیوٹن کے دستِ خاص سرنوف (آئیون سی ٹیریل) کی بیٹی تانیا سے ہو جاتی ہے۔ قالب کی ایک بیٹی لیلیٰ اور ایک بیٹا بلال ہیں۔ بعد ازاں جب قالب اپنی جڑوں کی تلاش میں ملک کی جانب مراجعت اختیار کرتا ہے، تو اس کی بیٹی لیلیٰ بھی اس کا بھرپور ساتھ دیتی ہے۔

بورے والا کے ظہیر الدین کو بھی اشتراکی نظام کی للک ماسکو کھینچ لے جاتی ہے۔ ظہیر کے والد شمس الدین انقلابی مارکسی فکر کے داعی ہوتے ہیں، تاہم ظہیر میں اپنے والد ایسی نظریاتی سپردگی نہیں ہوتی۔ ظہیر روسی نژاد گالینا سے شادی رچا لیتا ہے، اس کی بیٹی سویٹ لانا اور بیٹا بورس پوری طرح سرمایہ دارانہ نظام میں رچے بے ہیں۔ ظہیر کی دوستی وارث چوہدری سے ہے، اور وارث ہی کے مشورے پر وہ نظریاتی شکست کا مزہ چکھنے کے بعد نئی حقیقتوں سے مفاہمت کی کوشش کرتے ہوئے روسی سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ بننے کی ٹھان لیتا ہے۔ عیسائیت کی از سر نو مقبولیت سے روس میں جا بجا کلیساؤں کی تعمیر شروع ہو جاتی ہے، جن کی پیشانی پر نصب کرنے کے لیے صلیبیں درکار ہوتی ہیں۔ اس کام کا ٹھیکہ ظہیر کو مل جاتا ہے، مگر قسمت

کی ستم ظریفی کہ ظہیر کو صلیبیں بنانے کے لیے لینن کے مجسموں کی دھات کو ڈھالنا پڑ جاتا ہے۔ ظہیر بھی آخر کار مراجعت اختیار کرتا ہے۔

لاہور سے تعلق رکھنے والا مصطفیٰ اسلام شیخ بھی دیگر کرداروں کی مانند سوویت یونین کی نیرنگی سے متاثر ہو کر اور اشتراکی نظام کے فیوض و برکات کا شکر چکھنے کی غرض سے بوداپسٹ (ہنگری کا صدر مقام) میں سکونت اختیار کرتا ہے۔ مصطفیٰ کی شادی ایک چشتی روجا سے ہو جاتی ہے، اور روجا ہی کی خانہ بدوش خصلت اس کی بیٹی جینا اسلام کو بھی ماں سے ترکے میں ملتی ہے۔ جینا اپنے باپ مصطفیٰ کی مراجعت کے بعد اس کی تلاش میں لاہور آ جاتی ہے اور والد کی جنم بھومی کی رنگارنگیوں اور راوی کے قریب آباد سنیا سیوں سے اپنی خانہ بدوش مشابہتوں کے ادراک پر حیرت کا شکار ہوتی ہے۔

ان پانچ خاندانوں کے علاوہ بھی چند ضمنی کردار سامنے آتے ہیں، جن میں قادر قریشی کا کردار بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ قادر کا ہیرا منڈی سے ماسکو تک کا سفر بھی اگرچہ ہجرت ہی ہے، مگر یہاں دیگر کرداروں کے برعکس نظریے کے اثبات کے بجائے نظریاتی تکذیب نظر آتی ہے۔ قادر ایسے لوگوں کا دھرم حرص ہے، جس کے لیے وہ مکروہ سے مکروہ امور بھی بخوشی انجام دیتے ہیں، بشرطیکہ ان امور کی انجام دہی منفعت بخش ہو۔ تاہم، ایک کردار ایسا ہے جو ناول میں اجتماعی ضمیر کی طرح جگہ جگہ اپنی جھلک دکھاتا ہے، اور یہ کردار شوکی جھوٹے کا ہے۔ اس کردار سے منسلک تفصیلات بعض مقامات پر مضحکہ خیز رنگ بھی اختیار کر لیتی ہیں، مگر بحیثیت مجموعی، شوکی جھوٹے کرداروں کی کہانیوں میں گم کردہ کڑیوں کو جوڑ کر، قارئین کے ابہام کو دور کرنے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔

ناول کی کہانی نظریاتی شکست کے اعترافات سے مزین ہے۔ ناول کے عمل میں جا بجا ایسے مقامات آتے ہیں، جہاں کردار اپنے آپ کو نئی صورتِ حال سے مفاہمت کر لینے سے عاجز پاتے ہیں، ایسے مقامات پر جو مکالمے سامنے آتے ہیں، وہ سراپا تاسف و تامل سے مملو ہوتے ہیں۔ ہلٹر ڈاپنے شوہر عارف نقوی کی پس و پیش پر چیں بہ جبین ہو کر کہتی ہے:

جب تم اور تمہارے روشن خیال دوست لکھنؤ کی اندر سبھا سٹیج پر پر فارم کیا کرتے تھے اور تم ایک کرشن کے روپ میں سٹیج پر آتے تھے۔ کو ایک خدا نہ تھا، ایک عام انسان تھا تو نہ صرف اس کا پیراہن بلکہ اس کی مرلی بھی سرخ رنگ کی ہوتی تھی کہ وہ تمہارا تخلیق کردہ ایک نیا کرشن تھا۔ آریف تمہارا کسی بھی کرشن پر اب کچھ اختیار نہیں رہا۔ اگر اس نے ان زمانوں میں اپنے وہ سرخ لبادے ترک کر دیے ہیں جو تمہاری آرزو اور تخیل نے اسے پہنائے تھے اور اب وہی کرشن نیلے بدن والا سرمایہ داری نظام کی دھن پر رقص کر رہا ہے تو تم اس تبدیلی سے سمجھوتہ کر لو۔ جیسے میں نے کر لیا ہے۔ یہیں پر ایک ایشیائی اور یورپی ذہن کے درمیان جو خلیج ہے، وہ ظاہر ہوتی ہے۔ تم اپنی جذباتیت میں آدرشوں پر ابھی تک اٹل ہو۔ اور میں منطق کو بروئے کار لاتے ہوئے یہ جان چکی ہوں کہ کمیونزم کی بساط پر بچے جو ہمارے بادشاہ تھے وہ مات کھا چکے ہیں۔ جو کر جیت گئے ہیں (تارڑ، 2018، ص 21)۔

دراصل بیسویں صدی کے نصف اول میں، جب دنیا کے بیشتر ممالک سامراجی چنگل میں پھنسے ہوئے تھے، اشتراکی نظام ایک ایسا دیدہ زیب، مگر دل فریب خواب تھا، جس کو عملی شکل کاروپ دینا خواہ کیسا ہی غیر منطقی اور ناممکن کیوں نہ ہو، مگر کروڑوں انسانوں کی دلی خواہش ضرور تھا۔ معاشی مساوات کے ساتھ ساتھ، بین

الاقوامیت (Internationalism) کا نعرہ، نسلی تعصب اور تمدنی احساسِ کمتری کے حق میں سم قاتل تو تھا، مگر زمینی حقائق سے اتنا ہی گریزاں تھا۔ خاص کر یورپ کی سرزمین پر، جہاں رنگ و نسل کی برتری یورپی اقوام کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، وہاں بین الاقوامیت کے فروغ کی بات کرنا دیوانے کی بڑ ہی تو تھا۔ مگر اس عہد کے نوجوان اس پر فریب سپنے کو دیکھنے سے باز نہیں رہ سکے۔ ظہیر الدین کے ساتھ بھی ایسا ہی سانحہ پیش آیا، ایک شام وہ روسی نسل پرستوں کے ہتھ چڑھ گیا، جنہوں نے اس پر جی بھر کے تشدد کیا، جب وہ زخموں سے چور ہو کر گھر پہنچا تو اس کی بیوی گالینا کا ردِ عمل تبدیل شدہ زمینی حقائق اور نام نہاد آزاد دنیا (So-Called Free World) کی بے ضمیری کی قلعی کھول کر دکھ دیتا ہے، گالینا اپنے زخم خوردہ خاوند ظہیر سے کہتی ہے:

جب وہ ڈولتا لڑکھڑاتا ایک خون آلود چہرے کے ساتھ اپنے فلیٹ میں داخل ہوا تو گالینا نے اپنی وہیل چیئر سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بے اعتنائی سے کہا ”ظاہر میں نے تمہیں خبردار کیا تھا۔ تم اب سوویت یونین میں نہیں ہو۔ ایک آزاد جمہوری روس میں ہو۔ میں نے تمہیں خبردار کیا تھا۔ (اے غزالِ شب، ص 26)

وارث چوہدری اگرچہ دیگر نظریاتی مہاجرین کے برعکس بدلے ہوئے زمینی حقائق سے مفاہمت کر لیتا ہے اور روسی سرمایہ دارانہ نظام سے بھرپور فائدہ بھی اٹھاتا ہے، مگر اس کے دل میں کہیں اشتراکی نظریہ سے روگردانی اور سوویت یونین کے انہدام کے باعث گہرا رنج نہاں ہے۔ اس پر مستزاد ظہیر الدین سے مباحثوں کے باعث تنہائی میں اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے، اس کی خود کلامی (Soliloquy) میں مستنصر حسین تارڑ نے اس کشمکش کو بھرپور انداز سے پیش کیا ہے: تمہارے آبائی وطن میں تو اب بھی بندہ مزدور کے اوقات بہت سخت ہیں۔ وہاں اب بھی وہ کھیت ہیں جن میں دہقان کو روزی میسر

نہیں ہوتی اور اگر وہ کسان مشقتوں اور ذلتوں کے کولہو میں پس کر رزقِ خاک نہیں ہوا تو اب بھی اس کے محلے میں پنجابی ایک طوق کے مانند اس کا دم گھونٹتی ہے اور وہ اب بھی ایک بیل ہے۔ ایک ایسا بیل جس کے بخت میں بل میں سارا دن جتے رہنے کے بعد منہ مارنے کے لیے چارہ بھی نہیں ہے۔ اور تم، تمہاری ایک دعوت پر اتنا خرچہ اٹھتا ہے کہ تمہارے لیل پور کے ارد گرد جتنے بھی پسماندہ دیہات ہیں، وہاں سسکتے ہر کسان کو دو بیل نصیب ہو سکتے ہیں، وہ اگلے کئی برسوں تک دال روٹی کھا سکتے ہیں اور ان کے بچے دودھ کا ایک کٹورا پی سکتے ہیں۔ کئی برس تک صرف ایک شب کے اخراجات کے عوض۔ لیکن تم کو اس سے کیا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے ایک وفادار پرزے اور ایک دلال کی حیثیت سے تم کو کیا غرض۔ (اے غزالِ شب، ص 87)

چوہدری وارث کے ضمیر کی ملامت ظہر الدین کے برملا تاسف کے مرہونِ منت ہے۔ ظہیر کو جب سوویت یونین کے انہدام کے بعد از سر نو مذہبی جنون کے عام ہونے پر زیرِ تعمیر کلیساؤں کی صلیبوں کا ٹھیکہ ملتا ہے، تو دھات کی فراہمی کا مسئلہ درپیش آتا ہے، اس مسئلے کا حل یوں نکالا جاتا ہے کہ ماسکو کے تہ خانوں میں لینن کے دھاتی مجسموں کو ڈھال کر خام مال حاصل کیا جائے۔ یہی امر ظہیر الدین کی دل شکستگی پر مہیز کا کام کرتا ہے، جس کا اظہار وہ چوہدری وارث سے یوں کرتا ہے:

وارث، میں جب کسی بھی کلیسا کے ماتھے پر یا اس کے اندر ایک صلیب آویزاں دیکھتا ہوں اور وہ بے شک لینن کے کسی مجسمے سے نہ ڈھالی گئی ہو تو بھی وہ صلیب میرے سینے پر داغی جاتی ہے۔ جیسے ایک بیل یا گائے کا مالک اس کے جتے کو داغ دیتا ہے۔ وارث ہم جو درختاں مستقبل کے نقیب تھے، طوائفیں ہو گئے، سرمایہ داری نظام کے دلال بن گئے۔ (اے غزالِ شب، ص 86)

یہ واقعات ظہیر الدین کی باطنی تخریب پر منبج ہوتے ہیں۔ ظہیر کا والد شمس الدین انقلابی مرتے دم تک اشتراکی فکر سے وفاداری کا دم بھرتا رہا تھا، مگر اس کا لختِ جگر نہ صرف یہ کہ اشتراکی فکر سے منحرف ہو گیا ہے، بلکہ سرمایہ دارانہ نظام میں ایک چلتے پرزے کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔ لینن نے سوویت روس کے قیام میں کلیدی کردار ادا کیا تھا، کارل مارکس کے بعد اشتراکی فکر کے حوالے سے اگر کسی شخصیت نے بین الاقوامی سطح پر اپنا لوہا منوایا، تو وہ لینن ہی کی شخصیت تھی۔ اب جبکہ ظہیر الدین اس کے دھاتی مجسموں کو ڈھال کر کلیساؤں کی صلیبیں بنا رہا تھا، اور اس شمس الدین انقلابی کا پوتا بورس سیاحوں کو سوویت یونین کی یادگاریں بیچنے کا کاروبار چلا رہا ہے، یہ امور ظہیر الدین کے لیے نہایت تکلیف دہ تھے، یہی وجہ ہے کہ جب وہ مراجعت اختیار کر کے پاکستان پہنچتا ہے تو اپنے والد مرحوم شمس الدین انقلابی کی قبر پر اس کی خود کلامی میں یہ ندامت واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے، وہ انتہائی جذباتی انداز میں کہتا ہے:

برابر میں ایک کچی ڈھیری تھی جس کے پہلو میں کھجور کی سوکھی ہوئی شاخوں کا ایک جھاڑو پڑا تھا۔ ظہیر الدین نے وہ جھاڑو اٹھایا اور باپ کی قبر پر برسوں کا جو جھاڑ جھکار پڑا تھا، اسے سمیٹنے لگا۔ اور جب اس کی خستہ ہو چکی بارشوں سے دھنس چکی قبر کے آثار نمایاں ہوئے تو وہ ایک مجرم کی مانند اس کے سامنے سرنگوں ہو کر مٹی پر بیٹھ گیا۔ میں آپ کی مانند اپنے نظریات پر مستحکم نہیں رہ سکا۔ میں نے ایک مدت مدافعت کی۔ میں نے تب بھی اپنے آپ کو ایک مفاہمت کرتے جہوم میں تنہا رکھا جب آپ کے نظریاتی خوابوں کی ریاست اپنے پاؤں پر ڈھتی چلی گئی۔ پھر مجھ میں سکت نہ رہی۔ آپ کو دکھ تو ہو گا کہ میرا بیٹا کامریڈ لینن کے مجسموں کا بیوپاری ہو کر ان سے صلیبیں ڈال کر مذہب کی افیون کی قربان گاہوں پر ان کے چڑھاوے چڑھا رہا ہے۔ آپ کی

روح کو کتنی اذیت ہو رہی ہوگی۔ اگر آپ کی، یا کسی کی بھی روح ہوتی ہے تو۔ (اے غزالِ شب، ص 188)

ظہیر الدین کے برعکس سردار قالب کو اپنے انقلابی شاعر باپ سردار سیماب سے ایسی دل بستگی نہیں ہوتی۔ حالاں کہ سردار سیماب ترقی پسند نظریے کا بڑا پرچارک ہوتا ہے۔ درحقیقت، اس عدم دل بستگی کی پشت پر سردار سیماب کی غیر سنجیدگی کا ہاتھ ہوتا ہے۔ سردار قالب اور اس کے دیگر افراد خانہ فاقہ کشی کی نوبت تک جا چکے ہوتے ہیں، مگر سردار سیماب کی شرابی سرشت میں دنیا کے مظلوموں سے شاعرانہ وابستگی کا اعلامیہ اپنے بھوکے خاوندے سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے، سردار قالب اپنے باپ کی اس روش کو بیان کرتے ہوئے طنز آکھتا ہے:

میں تمہیں باغبان پورہ کے اس مکان میں لے چلوں گا جہاں میرا باپ گئی رات مداحوں کے کسی ناؤنوش کی محفل میں اپنی انقلابی شاعری کی داد سے مخمور لوٹا کرتا تھا اور اسے کچھ خبر نہ ہوتی تھی کہ اس شب بھی ہم تقریباً بھوکے سو گئے ہیں۔ وہ تو پوری انسانیت کی بھوک اور ناداری مٹانے کی جدوجہد کا پرچم اٹھائے تھا۔ اتنا خود غرض تو نہیں ہو سکتا تھا کہ محض اپنے بچوں کی بھوک مٹانے کے لیے اپنی جدوجہد کا رخ ہماری طرف موڑ دیتا۔ (اے غزالِ شب، ص 174)

مصطفیٰ اسلام شیخ اور عارف نقوی حادثاتی ملاقات کے بعد جب ایک دوسرے کا احوال جانتے ہیں، اور انھیں احساس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں حیرت آگیاں مماثلت موجود ہے تو مصطفیٰ اسلام شیخ انتہائی تلخ لہجے میں عارف نقوی سے کہتا ہے:

تمہیں پتہ ہے ہمارے اصل مجرم کون ہیں جنہوں نے ہمارے ساتھ فریب کیا۔ ترقی پسند شاعر اور دانش ور۔ انھوں نے ہمیں خواب دکھائے، انقلاب کے رومان کی آگ میں زندہ جلا ڈالا۔ ہم دیکھیں

گے۔ ہم تو نہ دیکھ سکے، نہ تاج اچھالے گئے، نہ تخت گرائے گئے اور نہ ہی خلق خدا نے راج کیا۔ اور چاند کو گل کریں تو جانیں۔ تو چاند بھی گل ہو گیا۔ (اے غزالِ شب، ص 168)

نظریے کی شکست کی تلخی تمام کرداروں کے یہاں یکساں قسم کی مایوسی کو جنم دیتی ہے۔ اشتراکی خواب بیسویں صدی کا سب سے سہانا خواب تھا۔ اس خواب نے صدیوں کے دورانیے کو محیط ظلم کی پچلی کے پاٹوں میں پستے عوام کو ایک امید عنایت کی تھی، کہ انھیں بھی سر اٹھا کر جینے کا پورا پورا حق حاصل ہے، کہ دنیاوی آسائشوں سے وہ بھی بہرہ ور ہو سکتے ہیں، کہ وہ بھی اتنے ہی انسان ہیں جتنا کہ اس دھرتی پر کوئی دوسرا شخص انسان ہونے کا دعویٰ ہے۔ مگر خواب کتنا عظیم تھا، اس خواب کے چکنا چور ہو جانے سے جنم لینے والی ناامیدی بھی ایسی ہی عمیق اور اندوہناک تھی۔ یہ ایک ایسا سانحہ تھا جس نے لاکھوں آنکھوں کے بنے ہوئے خوابوں کے نیچے ادھیڑ دیے تھے۔ عارف نقوی اس شکستِ خواب کا مصطفیٰ اسلام شیخ کے روبرویوں اعتراف کرتا ہے:

سب کچھ رائیگاں سا گیا۔ ہلڑ ڈال آویز حسن بھی اور میرا انقلابی کرشن بھی۔ راون جیت گیا اور رام کومات ہو گئی۔ نظریے کی سیتا پامال ہو گئی۔ مصطفیٰ مجھے کبھی یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ مزدوروں اور دہقانوں کی جنت کے یہ خواب دراصل ایک دیومالائی داستان تھے جسے ہم حقیقت سمجھ بیٹھے اور اس خواب کو پانے کے لیے اپنی زندگی وقف کر بیٹھے۔ ہم بے جگری سے یولیس کی مانند اپنے آدرشوں کی سنہری کھال کی جستجو میں یک چشم عفریتوں اور سائرین ڈانٹوں کے سیاہ سمندروں میں اتر گئے۔ اور یہ سائرین جادوگر نیاں سرمایہ داری نظام کی ڈانٹیں ہمیں فریب دینے کی خاطر ہمیں اپنے پاس بلانے کے لیے کیسے سحر انگیز گاتی تھیں لیکن ہم نے اپنے کانوں میں نظریے سے مکمل وابستگی کی موم بھر لی تاکہ ہم ان کے گیت سن ہی نہ سکیں۔ اپنے

خوابوں کی کشتی آرگو کو ترک کر کے ان کے گیتوں سے مسحور ہو کر سمندر میں چھلانگیں نہ لگا دیں۔ اور ہم اس دیومالائی واقعے کو دنیا کی سب سے بڑی حقیقت قبول کر کے، زندگی بھر چپو چلاتے رہے اور جب ہم منزل پر پہنچے تو وہاں نہ کوئی سنہری کھال تھی اور نہ افق پر کوئی سرخ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ سب رائیگاں ہوا۔ (اے غزال شب، ص 193)

بعض اوقات ایک نسل کے شکستہ ارادوں اور ادھورے خوابوں کو اگلی نسل آ کر حرکت و عمل سے شرمندہ تعبیر کرتی ہے، گویا امید کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوتے۔ ایسا ہی معاملہ ظہیر الدین کے انجام کے موقع پر بھی نظر آتا ہے۔ ظہیر الدین تمام عمر ماسکو کے برف زاروں میں گرم موسم میں افزائش پانے والے آک کے پودے کے اڑتے ریشوں کے تعاقب میں رہتا ہے، جو کہ اس کے بچپن کا پسندیدہ مشغلہ رہا تھا۔ انجام تک وہ اپنی یہ روش ترک نہیں کرتا اور خود بھی بکھر جاتا ہے، تاہم اس کی پریشانی میں ایک پہلو امید افزا بھی ہے، مستنصر حسین تارڑ ظہیر کے بکھرنے کے زمرے میں لکھتے ہیں:

زندگی میں پہلی بار اپنی سب کلفتوں اور دکھوں سے آزاد، اپنے سرخ خوابوں کی شکستگی کے ماتم سے آزاد وہ ایک مائی بوڑھی کی صورت میں کسی ایسے ویرانے کی جانب دھیرے دھیرے ڈولتا اڑتا چلا جاتا تھا جہاں وہ اپنے ریشوں کے اندر پوشیدہ بیج کو زمین کی کوکھ کے سپرد کر دے گا۔ کیا پتہ اس بیج سے ایک ایسی نسل جنم لے جو پھر سے انصاف، برابری اور عزت نفس کی بحالی کے پرچم تھام لے۔ (اے غزال شب، ص 285)

اسی موہوم امید کا ایک پر تو سردار قالب کی بیٹی لیلے کے اپنے باپ سے مکالمے میں بھی جھلکتا ہے۔ لیلے اپنے باپ کے ساتھ لاہور میں اپنے چچا کو ملنے جاتی ہے اور بہت جلد ہی اپنے عم زاد سے راہ و

رسم پیدا کر لیتی ہے، سردار قالب کی بیٹی جس پس منظر سے تعلق رکھتی ہے، وہ سراسر سرمایہ داریت کا پروردہ ہوتا ہے، تاہم اس کے دل میں اشتراکی رجحان کی جانب میلان پیدا ہونا جہاں اس کی انسان دوستی کی دلیل ہے، وہیں فاضل ناول نگار کا اس سے مقصود، اغلب ہے یہ ہو کہ سرمایہ داری کے گھر کو گھر کے چراغ ہی سے آگ لگے تو یہ نگار خانہ تباہ ہو گا، بصورت دیگر بیرونی حملے سہارنا اس نظام کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ لیلے اپنے باپ سردار قالب سے کہتی ہے:

جب آپ اپنے کامریڈ کے ہمراہ ایک دن گزارنے کے لیے جا رہے تھے اور آپ نے مجھے کزن میر کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ مجھے اس فٹ پاتھ پر لے گیا تھا جہاں سے وہ اگر خوش بخت ہوتا تھا تو ایک جانور کی حیثیت میں فروخت ہو جاتا تھا۔ اگر تو زندگی بھر کے لیے فروخت ہو جانا ہو تو انسان صبر کر لیتا ہے لیکن ہر روز ایک نئے مالک کا انتظار۔ ایک نئی غلامی کی خواہش۔ یہ کیسی ذلت آمیز جانور حیات ہے ڈیڈی۔ میں اس سے مفاہمت نہیں کر سکتی۔ آپ خود اقرار کرتے تھے کہ آپ کو کمیونزم یا ترقی پسند نظریات سے کچھ لگاؤ نہ تھا اور آپ جانتے ہیں کہ مجھے بھی نہ تھا کہ میں تو اس نظام کے انہدام کے بعد کی پیداوار ہوں۔ لیکن اس فٹ پاتھ پر بیٹھے پیشتر بھوکے، نادار اور فٹ پاتھ کی جانب بڑھنے والے ہر گاہک کی جانب کتوں کی ایک روٹی ایک بوٹی کے اشتیاق میں منتظر آنکھوں والے مزدوروں کو دیکھ کر میں اشتراکیت کے فلسفے کی قائل ہوئی۔ (اے غزال شب، ص 250-251)

بہر صورت، اس ناول کے تمام نمایاں کردار اعتراف شکست کے مرتفع ہیں۔ جس نظام سے وہ نظریاتی طور پر وابستہ ہے، وہ عالمی سطح پر شکست فاش سے دوچار ہوا۔ اس شکست کی وجوہات میں شاید سب سے واضح وجہ اشتراکی نظام ہی میں موجود تھی، کیوں کہ اس نظام کا نفاذ گو کہ دھرتی کو جنت بنا سکتا تھا، مگر کماحقہ نافذ العمل نہیں

تھا۔ لہذا ناول کے سبھی کردار نظریے کی آماج گاہوں سے فرار ہو کر اپنے وجود کی گہرائیوں میں اترنے کے خواہاں نظر آتے ہیں، تمام کردار عرفان ذات کے متنی ہیں۔ کیوں کہ انسانی مساوات اور بین الاقوامیت سے منسلک خواہوں کے چور چور ہونے کے باعث ان کی زندگیاں معنی سے محروم ہو گئی ہیں، اور لایعنیت کے لق و دق صحرائیں یہ سب کردار اپنے وجود کے نخلستان کی تلاش میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ کبھی ان کے دل میں اپنی جنم بھومی کے لیے ہوک اٹھتی ہے، اور کبھی ان کے دل طبقاتی انہدام کے بے جان نعروں پر موسوس کر رہ جاتے ہیں۔ اسی تناؤ کو مکالمے کی صورت میں عارف نقوی نے مرنے سے پیشتر اپنے آخری اندر سبھا سٹیج پر کچھ یوں ادا کیا ہے:

کون جانے ہم کب تک زندہ رہتے ہیں۔ تو اے ارجن موت نیزوں اور بھالوں کے بدن میں اترنے سے واقع نہیں ہوتی بلکہ پرامتا کو بھلا دینے سے ہی انسان مر جاتا ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ موت کی حقیقت کیا ہے؟ جانتے ہو ارجن ... جب تم ایک نظریے کو دھرم کی مانند اپنی رگوں کے خون میں شامل کر لیتے ہو اور اس کے لیے اپنی دھرتی اور پرکھوں کا دھرم تیاگ دیتے ہو اور پھر تم چاہے کتنی ہی بے جگری اور بہادری سے اس مہابھارت کے یدھ میں جنگ کرو، تمہارے نیزے ٹوٹ جاتے ہیں، تمہارے بھالے موم ہو جاتے ہیں، تم نہتے مارے جاتے ہو۔ اے ارجن میں بھی یونہی تاریک راہوں میں مارا گیا۔ میں ہارنے والے قبیلے میں سے نہ تھا، پر مجھے لکشی کے ندیدے اور لالچی پجاریوں نے مات دے دی۔ ارجن دراصل یہی موت ہے۔ تم سے وعدہ کیا جاتا ہے لیکن نہ تخت اچھالے جاتے ہیں اور نہ تاج۔ نہ ہی خلق خدا راج کرتی ہے۔ اور تم تاریک راہوں میں مارے جاتے ہو۔ (اے غزال شب، ص

(295)

یہ ناول جہاں شکستِ خواب کا اعتراف ہے، وہیں مارکسیت اور وجودیت کے رشتے پر بھی گراں قدر روشنی ڈالتا ہے۔ دراصل مارکسیت اور وجودیت محض نمونیاتی تبدیلی ہی نہیں ہیں، بلکہ دونوں کے بیچ ایک داخلی رشتہ بھی ہے۔ فرانسیسی مفکر ژاں پال سارتر (1905-1980) اس فلسفے کو وجودی مارکسیت (Existential Marxism) کا نام دیتے ہیں۔ سارتر نے اس فلسفے کی بدولت سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف مزاحمت کی نئی شعریات مرتب کرنے کی سعی کی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا یہ ناول اس تناظر میں نہایت اہم ہے کہ اس دستاویز میں مارکسیت اور وجودیت کے الگ الگ مکاتیب فکر کو باہم دست و گریباں دکھانے کے بجائے آمیزتہ شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ وجودیت اور مارکسیت کے اسی داخلی تعلق کے متعلق ابن حسن لکھتے ہیں:

چاہے کوئی وجودیت کو آزادی کا سچا فلسفہ سمجھتا تھا یا غلط شعور کی ایک قسم جس نے انقلابیوں کی پوری نسل کو بانجھ بنا دیا، لیکن ایک چیز پر سب متفق ہیں کہ شروع میں آزادی اور انقلاب کو لازم و ملزوم قرار دیا گیا۔ اس نے نوجوانوں کو بہت متاثر کیا۔ لیکن انقلاب پانہ ہو سکے، یا بیچ ہی میں چھوڑ دیے گئے۔ اب سارتر نے مادیت کی افادیت اور سچائی کی بات کی جب اسے وجودیت کے ساتھ ضم کر دیا جائے۔ جب سارتر وجودیت اور مارکسزم کے مابین جھولتا ہے تو طریق کار Methodology کے سوال پر جسے سارتر "The Progressive-Regressive Method" کہتا ہے یہ ہے کہ وہ وجودیت کو اس وقت تک روکے رکھے گا جب تک یہ مارکسزم میں مربوط نہیں ہو جاتا (ابن حسن، 2023، ص 589)۔

مکالمے کا نیا پہلو:

مارکسیت اور وجودیت کو عمومی طور پر حریف مکاتیب فکر گردانا جاتا ہے۔ حریف یا حلیف کی بحث سے قطع نظر، اس مقالے میں

مارکسیت اور وجودیت کے داخلی رشتوں کو مستنصر حسین تارڑ کے ناول اے غزالِ شب کے تناظر میں واضح کیا گیا ہے اور وجودی مارکسیت کی فعالیت کو تخصیصی استناد کی روشنی میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ لہذا اس مقالے کی بدولت اردو ناول کی تفہیم میں وجودی مارکسیت کے حوالے سے جہاں نئے مباحث جنم لیں گے، وہیں توضیح و تعبیر کی راہیں بھی ہموار ہوں گی۔

حاصل بحث:

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ناول اے غزالِ شب میں مارکسیت اور وجودیت کے مابین مطابقت پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ ناول بیسویں صدی کے عظیم خواب، اشتراکی نظام کی عالمی سطح پر شکست کو موضوع بناتا ہے۔ اس ناول میں کرداروں کی داخلی کشش کی بدولت عرفانِ ذات کی منزل تک رسائی حاصل کرنے کی شدید خواہش دکھائی گئی ہے۔ یہ ناول مارکسیت اور وجودیت کے افتراق کو دھندلا دیتا ہے، اور یہ باور کرانے کی سعی کرتا ہے کہ وجود کی انفرادیت بہر حال باقی رہتی ہے، چاہے انسان کا مطمح نظر کوئی اجتماعی کاوش ہی کیوں نہ ہو۔ وہیں، یہ ناول محض انفرادیت پسندی کا بھی پرچارک نہیں ہے، کیوں کہ انسانی وجود کا پھیلاؤ ہر دو، داخلی اور خارجی سطحوں سے عبارت ہے۔ لہذا، کسی ایک پہلو پر حد سے زیادہ انحصار کرنا، سکے کے ایک رخ پر ہی اکتفا کرنے کے مترادف ہے۔ اے غزالِ شب وجودی مارکسیت کی نمایاں ترین مثال ہے۔

حوالہ جات

- اقبال خورشید، اے غزالِ شب، روزنامہ ایکسپریس کراچی (10 جولائی، 2014)
 عتیق اللہ، پروفیسر، تنقید کی جمالیات (جلد 4) (لاہور: فکشن ہاؤس، 2018)
 مستنصر حسین تارڑ، اے غزالِ شب (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2018)
 ابنِ حسن، ادب اور معروضی حقیقت: مارکسی جمالیات میں ایک مطالعہ (لاہور: عکس پبلی کیشنز، 2023)

References

- Iqbal Khursheed, *Ay Ghazaal-i Shab*, Daily Express Karachi (July 10th, 2014)

- Ateeq Ullah, Professor, *Tanqeed ki Jamaliyaat* (Volume 4) (Lahore: Fiction House, 2018)
 Mustansar Hussain Tarar, *Ay Ghazaal-i Shab* (Lahore: Sangemeel Publications, 2018)
 Ibn-i Hassan, *Adab aur Maroozi Haqeeqat: Marxi Jamaliyat mein aik Mutalea* (Lahore: Aks Publications, 2023)